☆ پروفیسر ظفر احمد

فکر ونظر کی مستحکم بنیادیں

(بحوالہ تردید انکارِ حدیث)

۱) حُجیت حدیث (الف): -

منکرین حدیث کا دعویٰ ہے کہ چونکہ قرآن کریم ایک مفصّل کتاب ہے لہذا اسے سمجھنے کے لئے بقول ان کے حدیث کی ضرورت نہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ قرآن کریم یا تو رسول کریم ﷺ کے تعلیم دیئے اور سمجھائے بغیر مفصّل ہے یا آپ کی تعلیم، قولی وفعلی تفسیر وتبیین سے مفصل ہوا ہے۔ اگر پہلی شق اختیار کی جائے تو رسول اکرم ﷺ کا معلم وشارح کتاب ہونا معاذ اللہ بیکار ہوا کیونکہ اس صورت میں جو کتاب پہلے ہی مفصل ہے، منکرین حدیث کے اپنے عندیہ کے مطابق اس کی تفصیل بیان کرنا تحصیل حاصل کے سوا کچھ نہیں حالانکہ قرآن کریم میں جابجا اس مضمون کی آیات موجود ہیں کہ یہ رسول لوگوں کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے اور ان کے اخلاق کو سنوارتا ہے۔ نیز ارشاد ہے وانزلنا الیک الذکر لتُبین للناس مانُزّل الیھم (۱) ''یعنی ہم نے تیری طرف نصیحت (بصورت قرآن) اتاری ہے تاکہ جو کچھ اتارا گیا ہے تو اسے ان لوگوں کے لئے کھول کر بتائے''۔ اگر دوسری شق اختیار کی جائے اور کہا جائے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قولی وفعلی تشریح کے بعد قرآن مفصل ہوا کہ اس سے مجمل احکام ومسائل واضح ہوئے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل یعنی حدیث کا حجت (اتھارٹی۔سند) ہونا بطریق احسن ثابت ہوگیا۔ نیز یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ اگر قرآن کریم کے مفصل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی تفسیر کی حاجت نہیں تو منکرین حدیث مثلاً غلام احمد پرویز نے ''معارف القرآن'' کے نام سے تفسیر کیوں لکھ ڈالی؟ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول وفعل سے کتاب اللہ کی جو تشریح فرمائی ہے وہ تو بقول منکرین حدیث (معاذ اللہ) حجت نہیں اور منکرین حدیث کی تفسیر کے نام پر خرافات معتبر اور قابل قبول ہوں، کیا یہ توہین رسالت کی بدترین جسارت نہیں؟ اصل حقیقت یہ ہے کہ کسی کتاب کے مفصل ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ اسے سمجھنے کے لئے کسی معلم کی ضرورت نہیں مثلاً علم ہندسہ پر کوئی کتاب مفصل ومکمل ہو تو یہ سمجھ لینا کس قدر حماقت ہے کہ ایسی مفصل ومکمل کتاب کو ہر شخص ہر حال میں از خود سمجھ لے گا اور کسی ماہر فن استاد سے رجوع کی ضرورت ہی نہیں۔ پھر کتاب کا معلم وشارح جو کچھ بتائے گا وہ کتاب کے متن کے علاوہ بھی بہت کچھ بتائے گا۔ یہ تو نہیں

☆ ایسوسی ایٹ پروفیسر (ریٹائرڈ) وسابق صدر شعبہ علوم اسلامیہ، گورنمنٹ ایس ای کالج بہاولپور

کہ وہ کتاب کے کسی مشکل مضمون کی وضاحت کے لئے خود اسی کتاب کی ورق گردانی کر کے ہر مرتبہ کتاب ہی کا متن پڑھ دے اور اپنی طرف سے کچھ بھی نہ بتائے۔ الغرض کسی کتاب کے مفصل اور مکمل ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ایسی کتاب لازماً ہر پہلو اور ہر حیثیت سے اتنی آسان بھی ہو کہ معلم و شارح کی ضرورت ہی باقی نہ رہے مثلاً قرآن کریم سے مسائل شرعیہ کا استنباط پر کسی کا کام نہیں گو اس کتاب سے پچھلی امتوں کے حالات پر غور کر کے نصیحت قبول کرنا آسان ہے۔

لفظ مُفصَّل اسم مصدر ''تفصیل'' سے اسم مفعول ہے جس کا معنی ہے ''کھول کر بیان کیا ہوا کوئی مضمون یا کوئی بھی بات''۔ پس لازماً ہر ''مفصل'' شے مثلاً کتاب کا کوئی ''مُفصَّل'' یعنی تفصیل سے بیان کرنے والا بھی ضرور ہوگا۔ قرآن کریم اس معنی میں مفصل ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اس کی تفصیل و تشریح خود اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و فعل سے اسی ربانی تبین و تشریح کو امت تک منتقل فرمایا ہے چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے الٓر کتاب احکمت آیاتہ ثم فُصّلت من لدن حکیم خبیر (۲) ''الٓر۔ یہ کتاب (قرآن کریم) ہے کہ اس کی آیات مستحکم ہیں پھر ان کی تفصیل حکیم و خبیر (اللہ) کی طرف سے بیان کر دی گئی ہے'' اس آیت سے صاف واضح ہو رہا ہے کہ قرآن کریم کی آیات کو پہلے مرحلے میں مستحکم کیا گیا ہے یعنی قرآنی مضامین مُدلّل ہیں اور دوسرے مرحلے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اور پھر آپ کے ذریعہ امت محمدیہ کے لئے ان آیات کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ چنانچہ آپ کے اقوال و افعال سے قرآن کریم مفصل ہوا ہے یہی وجہ ہے کہ آپ کو اس کتاب کا معلّم اور شارح قرار دیا گیا ہے و یعلمھم الکتاب والحکمۃ و یزکیھم (۳) ''یعنی (یہ پیغمبرؐ) انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور ان کے (اخلاق و عادات کا) تزکیہ کرتا ہے''۔ وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم (۴) ''اور ہم نے تیری طرف یہ نصیحت اتاری ہے تاکہ تو لوگوں کے لئے (اس وحی کی) تشریح و توضیح کرے جو ان کی طرف اتاری گئی ہے''۔

(ب) حصرِ عقلی کے اعتبار سے تین صورتیں ہی ممکن ہیں چوتھی کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی قول و فعل بھی (معاذ اللہ) حجت نہیں۔ یا آپ کے بعض اقوال و افعال حجت ہیں اور بعض نہیں یا آپ کے سب اقوال و افعال حجت ہیں۔

اگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی قول و فعل بھی معاذ اللہ حجت نہیں تو قرآن کریم اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان ممکن ہی نہیں کیونکہ قرآن کریم کا کتاب اللہ ہونا اور خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا رسول اللہ ہونا آپ کے قول ہی سے تو معلوم ہوا۔ پس پہلی شق باطل ہے۔

اگر دوسری شق اختیار کی جائے کہ آپ کے بعض اقوال و افعال تو حجت ہیں اور بعض نہیں تو آپ کے جو اقوال و افعال (معاذ اللہ) حجت نہیں ، یا وہ قرآن کریم کے مطابق ہونگے یا مخالف و معارض ہونگے یا نہ ہی کتاب اللہ کے مطابق ہونگے اور نہ ہی اس کے مخالف و معارض ہونگے بلکہ کتاب اللہ پر زائد ہونگے اور کتاب اللہ سے بظاہر ان کا اثباتاً یا نفیاً تعلق نہ ہوگا۔ اگر یہاں پہلی شق اختیار کی جائے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جو بعض اقوال و افعال (معاذ اللہ) حجت نہیں وہ کتاب اللہ کے مطابق ہیں تو اس صورت میں خود قرآن کریم ہی کا انکار لازم آیا۔ اگر یہ اقوال و افعال کتاب اللہ کے مخالف و معارض ہیں تو یہ اختلاف یا محض ظاہری و صُوری ہوگا، حقیقی نہ ہوگا یا حقیقی ہوگا۔ پہلی صورت میں ان اقوال و افعال کو حجت تسلیم نہ کرنے سے قرآن کریم کا انکار لازم آیا کیونکہ ظاہری اور صُوری اختلاف دراصل اختلاف ہوتا ہی نہیں۔ ایسے اقوال و افعال کی کتاب الٰہ سے تطبیق ممکن ہوگی اور ان اختلافات کی معقول اور مناسب توجیہہ اور تاویل مشکل نہ ہوگی۔ اگر یہ تعارض و اختلاف حقیقی ہے جسے دور نہ کیا جا سکے اور ان اقوال و افعال کی کتاب اللہ سے تطبیق کسی طرح بھی ممکن نہ ہو اور نہ ہی کوئی معقول توجیہہ ہو سکے، تو کتاب اللہ سے معارض و مخالف ایسے اقوال باطل ہونگے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض اقوال و افعال باطل تھے۔ اس صورت میں آپ کے کسی بھی قول و فعل کا اعتبار نہ رہا، سب مشتبہ ہو گئے لہذا قرآن کریم پر بھی ایمان ممکن نہ رہا۔ الغرض حدیث کا انکار دراصل قرآن کریم ہی کا انکار ہے۔ انکارِ حدیث کے ساتھ قرآن کریم پر ایمان کا دعویٰ سراسر فریب نفس ہے۔

اگر کہا جائے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ بعض اقوال و افعال جو (معاذ اللہ) حجت نہیں ، وہ نہ تو کتاب اللہ کے مطابق ہیں اور نہ ہی اس کے مخالف و معارض ہیں بلکہ کتاب اللہ پر زائد ہیں یعنی ان کے متعلق قرآن کریم میں کوئی امر یا نہی موجود نہیں بلکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اقوال و افعال کا قرآن کریم سے استنباط فرمایا ہے اور کوئی بھی حاکم اعلیٰ (بقول منکرین حدیث ''مرکز ملت'') اپنے دور میں جزئیات کا استنباط کر سکتا ہے، تو استنباط (مسائل اخذ کرنے) کے لئے کوئی بنیاد بھی تو ہونی چاہیے۔ مثلاً نمازوں کی رکعات اور ان کی تحدرد، زکوٰۃ کی ڈھائی فیصد شرح، عید الفطر کے لئے یکم شوال اور عید الاضحیٰ کے لئے دس ذی الحجہ، حج کے مہینوں اور مناسکِ حج کے مخصوص ایام کا تعین وغیرہ وغیرہ لاتعداد ایسے مسائل ہیں کہ دنیا بھر کے عقلاء جمع ہو کر بھی قرآن کریم سے ان مسائل کو اخذ نہیں کر سکتے۔ پس ثابت ہوا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال بھی وحی ہیں بالفاظ دیگر حدیث رسول حجت ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ مذکورہ طرز کی جزئیات کا علم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی نہیں ہوا بلکہ آپ نے اپنی رائے اور عقل سے انہیں معلوم کیا ہے تو آپ کو ایسا کرنے کی اجازت اللہ تعالیٰ نے دی ہو

گی یا نہیں دی ہوگی۔ اگر جازت نہیں دی تو قرآن کریم میں ہے ام لھم شرکاء شرعوالھم من الدین مالم یأذن بہ اللہ (۵) ''یعنی کیا ان کے ایسے شریک بھی ہیں جنھوں نے ان کے لئے دین کی وہ باتیں وضع کیں جن کا حکم اللہ نے نہیں دیا''۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور کسی کو بھی از خود شرعی مسائل وضع کرنے کا ہرگز اختیار حاصل نہیں ہے۔ شارع حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو شارع (قانون ساز) بطور اسنادِ مجازی کہا جاتا ہے کہ آپ نے شرعی مسائل اللہ تعالیٰ سے معلوم کر کے لوگوں کو بتائے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ مذکورہ طرز کی جزئیات وضع کرنے کی اجازت اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دی تھی اور اللہ تعالیٰ نے آپ کے فکری و اجتھادی غلطی سے محفوظ رکھنے کا اہتمام بھی فرمایا تھا تو ثابت ہوا کہ دین کے متعلق آپ کے قلب مبارک میں جو خیال بھی آیا وہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے اور غلطی سے محفوظ ہونے کی بناء پر حجت (اتھارٹی) بھی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم سے ثابت ہے کہ پیغمبر پر وحی کا نزول ہمیشہ ارسال ملک یعنی فرشتہ بھیجنے کے ذریعہ ہی نہیں ہوتا بلکہ فرشتہ بھیجے بغیر بھی ہوتا ہے۔ **ما کان لبشر ان یکلمہ اللہ الا وحیاً او من وراء حجاب أویرسل رسولا** (۶) ''یعنی کسی بشر کے لائق نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے اگر بذریعہ وحی یا پردے کے پیچھے (سے کلام کرے گا) یا (اس مقصد کے لئے اپنے) ایلچی (فرشتے) کو بھیجے گا۔ آیت میں پیغمبر پر نزول وحی کی تین صورتیں مذکور ہیں پہلی صورت فرشتہ بھیجے بغیر وحی کی ہے، دوسری صورت پس پردہ کلام کی ہے جیسے کوہ طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام ہوا۔ معراج کے موقع پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کلام ہوا۔ تیسری صورت فرشتہ بھیج کر وحی نازل کرنے کی ہے۔ قرآن کریم سے ثابت ہے کہ پیغمبر کا خواب بھی وحی ہوتا ہے چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے صاحبزادے حضرت اسماعیل اللہ السلام سے فرمایا تھا۔ **یٰبنی انی اریٰ فی المنام انی اذبحک فانظر ماذا تریٰ** (۷) ''یعنی اے میرے بیٹے! میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھے ذبح کرتا ہوں، تو دیکھ تیرا کیا خیال ہے؟'' اسی طرح پیغمبر کے دل میں دینی امور کا القاء بھی وحی ہے خواہ بواسطہء ملک ہو یا بلا واسطہ مَلک ہو۔

اگر یہ کہا جائے کہ ان جزئیات کا تعین گو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم باذن الٰہی کرتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو فکری خطاء سے محفوظ رکھنے کا کوئی انتظام نہ فرمایا تھا، لہذا آپ کی طے کردہ جزئیات وحی نہیں بلکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمانوں کا حکمران اعلیٰ ایسی جزئیات از خود یا لوگوں کے مشورے سے وضع کرنے کا مجاز ہوگا تو اس صورت میں:-

اولاً تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معصوم عن الخطاء ہونا قرآن سے ثابت ہے سورہ النساء میں ہے **یایھاالذین امنوااطیعوا اللہ واطیعو الرسول و اولی الا مر منکم فان تنازعتم فی شیئ فردّوہ الی**

اللّٰہ و الرسول ان کنتم تومنون باللّٰہ والیوم الا خر الآیۃ (۸) ''یعنی اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے میں سے اولوالامر (حکام وعلماء) کی اطاعت کرو۔ پھر اگر تمہارا کسی معاملے میں (ان علماء وحکام) سے جھگڑا ہو جائے تو اس (معاملے) کو اللہ اور رسول (قرآن وسنت) کی طرف لوٹاؤ، اگر تم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو'' دیکھئے یہاں غیر مشروط اطاعت صرف اللہ اور رسول کی ہے اسی لئے اللہ اور رسول سے تو کسی تنازعہ کی نہ گنجائش ہے نہ ایسا کوئی سوال ہی پیدا ہوتا ہے پس آیت سے رسول کا معصوم عن الخطاء ہونا ثابت ہوا تبھی تو رسول کی اطاعت غیر مشروط ہے جبکہ اولوالامر معصوم عن الخطاء نہیں اسی لئے ان سے اختلافِ رائے کی گنجائش اہل علم کے لئے موجود ہے۔ اگر اولوالامر کو اللہ قرار دیا جائے تو یہ کھلا شرک ہے اور اگر انہیں رسول قرار دیا جائے تو یہ ختم نبوت کا کھلا انکار ہے۔ اگر ان اولوالامر کو اپنے مقام پر رکھا جائے تو ان سے اختلافِ رائے درست ہے اور اس اختلاف اور جھگڑے کو دور کرنے کے لئے اللہ اور رسول یعنی قرآن وسنت کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ اسی سے سنت رسول اور حدیث رسول کا حجت ہونا بخوبی واضح ہو رہا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں فلاوربك لایؤمنون حتیٰ یحکموك فیما شجر بینھم ثم لا یجدوافی انفسھم حرجامّما قضیت ویسلموا تسلیما (۹) ''تیرے رب کی قسم یہ لوگ مومن نہیں جب تک اپنے تنازعات میں تجھے منصف نہ بنائیں اور جو فیصلہ تو کرے اس سے وہ اپنے دلوں میں تنگی محسوس نہ کریں بلکہ اسے بخوشی پوری طرح تسلیم کریں''۔

ثانیاً اس صورت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہی (معاذ اللہ) سرے سے بیکار ٹھہرتی ہے۔ قرآن کریم کو کسی بھی میدان ڈال دیا جاتا۔ لوگوں کو چاروں طرف سے غیبی آوازوں کے ذریعہ مطلع کر دیا جاتا کہ اسے قبول کرو۔ ہم نے کلیات بیان کر دئے ہیں ان کے تحت ہر دور میں تمہارے حکمران (بقول منکرین حدیث ''مرکز ملت'') جزئیات وضع کرنے کے ازخود یا اپنے ساتھیوں کے مشورے سے مکمل مجاز اور آزاد ہونگے۔

ثالثاً اگر حکمران اعلیٰ کو قرآن کریم میں بیان کردہ کلیات کے تحت جزئیات وضع کرنے کا اختیار حاصل ہے تو قرآن کریم میں کسی بھی جزئیے کے بیان کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی بلکہ کلیات کی بھرمار کی بھی کیا ضرورت تھی؟ مثلاً یہی ایک آیت بطور کلیہ کافی تھی۔ وماخلقت الجن والانس الّا لیعبدو ن (۱۰) ''یعنی میں نے جن وانس کو صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے''۔ جن وانس کی زندگی کے واحد مقصد کو واضح کرنے والی یہ آیت واحد کلیہ کا کام دیتی اور نام نہاد مرکز ملت کو ازخود یا لوگوں کے مشورے سے جزئیات طے کرنے میں مکمل آزاد چھوڑ دیا جاتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ بالغہ کے تحت کچھ جزئیات قرآن کریم میں بیان کر دیں اور باقی ''مرکز ملت'' کے لئے چھوڑ دیں کہ وہ اپنی من مانی کر سکے تو

ہمارا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ کے تحت کچھ جزئیات قرآن کریم میں بیان کر دیں۔ دیگر بہت سی جزئیات رسول اللہؐ نے بیان کر دیں اور نئے پیش آمدہ مسائل میں ہر دور میں مجتہدین اور فقہاء نے قرآن وسنت سے اخذ کر کے بیان کر دیں۔ اس سے کسی بھی حکمران اعلیٰ یا نام نہاد مرکز ملت کو یہ اختیار نہیں مل گیا کہ وہ خود یا دوسروں کے مشورے سے جزئیات وضع کرتا پھرے اور یہ جزئیات آئے دن بدلتی رہیں۔ لہذا یہ شبہ صحیح نہیں کہ اگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طے کردہ جزئیات ڈالتی ہوتیں تو قرآن میں مذکور ہوتیں۔ قرآن کریم میں بار بار لوگوں کو رسول اکرمؐ کی غیر مشروط اطاعت واتباع کا مطلق حکم دیا گیا ہے جو کسی خاص زمانے تک ہی محدود نہیں۔ قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللّٰہ (۱۱) ''(اے پیغمبر!) تو کہہ دے اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو اللہ تم سے محبت کرے گا''۔ من یطع الرسول فقد اطاع اللّٰہ (۱۲) ''جس نے رسول کی اطاعت کی تو بے شک اس نے اللہ کی اطاعت کی'' وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ (۱۳) ''اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اس لئے تو بھیجا ہے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے''۔ بس رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ جزئیات خود قرآن کریم کی تصریح کے مطابق حجت ہیں اور یوں یہ قرآن سے خارج نہیں گو فرداً فرداً قرآن میں مذکور نہ ہوں۔ اگر سب جزئیات فرداً فرداً قرآن کریم میں مذکور ہوتیں تو اس کا حجم لاتعداد جلدوں پر محیط ہوتا۔ قرآن وحیم متلو ہے یعنی اس کی تلاوت بھی بجائے خود مقصود ہے اور اسے زبانی یاد کرنا اس کی حفاظت کا بہت بڑا ذریعہ اور بہت بڑی فضیلت ہے۔ لوگوں کو اتنے بڑے حجم کے قرآن کی تلاوت اور زبانی یاد کر کے اس کی صدری حفاظت میں سخت دشواری پیش آتی بلکہ عادۃً یہ کام ان کے لئے محال ہوتا۔ نیز بہت سی جزئیات کا صحابہ کرامؓ کے بعد آئندہ امت تک یقینی قطعی کی بجائے ظنی ذرائع سے پہنچنا امت کے لئے باعثِ رحمت ہے۔ اس کی وضاحت آئندہ سطور میں مناسب مقام پر ہوگی۔

رابعاً یہ نام نہاد سنہری اصول قرآن کریم میں صاف صاف مذکور ہونا چاہیے تھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال آپ کی دینوی زندگی تک لوگوں کے لئے حجت ہیں آپ کے انتقال کے بعد تمہارے حکمران تمہارے لئے نئے حالات میں یہ مسائل از خود وضع کر سکتے ہیں، ان میں ترمیم کر سکتے ہیں یا انہیں چاہیں تو منسوخ کر سکتے ہیں۔ کیونکہ منکرین حدیث کے خیال میں یہ تو اصولی مسئلے کی حیثیت سے ایک اہم ''کلیہ'' ہے مگر اس کے باوجود قرآن کریم میں اس کا کوئی نام ونشان تک نہیں۔ یہاں وامرھم شوریٰ بینھم (اور ان کے کام باہم مشورے سے ہوتے ہیں) کا حوالہ دینا بیکار ہے کیونکہ یہاں انتظامی امور میں مشورہ کی تعلیم ہے خواہ ان کا تعلق دینی امور کے عملی نفاذ کی تدابیر سے ہو یا دینوی امور کا انتظام وانصرام مقصود ہو۔ اسی طرح مشورے کا تعلق نئے پیش آمدہ اجتہادی مسائل سے بھی ہو سکتا ہے جو قرآن وسنت میں

صراحۃ مذکور نہ ہوں اور مجتہدین وفقہاء ان کا قرآن وسنت سے استنباط کریں۔ جو مسائل قرآن کریم نے واضح کرائے اور جزئیات رسول اکرمؐ نے طے فرمادیں جن مسائل پر امت کا اجماع ہو چکا ان میں ترمیم و تنسیخ کے لئے مشورہ سرتے سے خارج از بحث ہے۔ اگر ایسی کوئی گنجائش ہوتی تو اس کا ذکر بغیر کسی ابہام و اشتباہ کے صاف صاف کھلے لفظوں میں ہونا چاہیے تھا اور منکرین حدیث تا قیامت اس کی نشاندھی نہیں کر سکتے۔ ورنہ اس طرح کے مشورے سے قرآن کریم میں بھی منکرین حدیث کے لئے ترمیم وتنسیخ کی گنجائش ہونی چاہیے۔

خامسا یہ بعینہ وہی بدترین شرک ہے جس میں عیسائی مبتلا ہوئے۔ ان کے رومن کیتھولک چرچ میں پوپ کو مکمل (نام نہاد) تشریعی اختیارات حاصل ہیں اس کا ہر نام نہاد دینی حکم خدا کا حکم ہے قرآن کریم میں ان عیسائیوں کے متعلق ہے۔ اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ والمسیح بن مریم (۱/۱۴) ''یعنی ان (عیسائیوں) نے اپنے علماء اور درویشوں کو اور مسیح بن مریم کو اللہ کے ماسوا اپنا رب بنالیا''۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ عیسائی حضرات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تو زبان سے ابن اللہ یعنی اللہ کا بیٹا قرار دیتے ہیں اور انہیں خدائی اختیارات کا مالک سمجھتے ہیں لیکن کسی عیسائی نے اپنے کسی پوپ کو یا دیگر مذہبی رہنماؤں کو زبان سے خدا نہیں کہا۔ وہ یہی کہتے ہیں کہ پوپ خدا کا اور یسوع مسیح (حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نمائندہ ہے اور اس کا حکم خدا ہی کا حکم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی کو ''رب بنانا'' قرار دیا ہے۔ انکارِ حدیث کی آڑ میں ''مرکز ملت'' کو ''اللہ ورسول'' قرار دے کر اسے از خود یا اپنے ساتھیوں کے مشورے سے شرعی احکام وضع کرنے کے اختیارات سونپ کر اور یوں اسے پوپ سے بھی کہیں زیادہ مقدس قرار دے کر ہمہ گیر نظام پاپائیت قائم کرنے کا یہ حیلہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف شعوری یا غیر شعوری مگر احمقانہ جسارت ہے کیونکہ طویل، صبر آزما اور جان گسل جد وجہد کے بعد عیسائیوں نے تو پوپ کو معاشی، معاشرتی اور سیاسی نظام سے بیک بینی و دوگوش نکال باہر کیا ہے اور اسے صرف پوجا پاٹ اور چند معاشرتی مذہبی رسوم تک محدود کر دیا ہے لیکن منکرین حدیث اپنے نام نہاد مرکز ملت کو ''اللہ اور رسول'' قرار دے کر ہمہ جہتی وہمہ گیر لامحدود اختیارات سونپ کر قرونِ وسطیٰ کے ظالمانہ نظام پاپائیت کو امتِ مسلمہ پر مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ عیسائیوں نے اپنے پوپ و دیگر مذہبی رہنماؤں کو زبان سے خدا نہیں کہا تھا لیکن یہ منکرین حدیث زبان سے بھی نام نہاد مرکز ملت کو ''اللہ و رسول'' قرار دیتے ہیں کہ بقول ان کے قرآن کریم میں جہاں بھی اللہ اور رسول کی اطاعت کا حکم ہے۔ وہاں ان کا نام نہاد مرکز ملت مراد ہے۔ یوں منکرین حدیث نصاریٰ سے بھی آگے نکل گئے۔ نظام پاپائیت کے اجراء واحیاء کی یہ کوشش اگر شعوری ہے تو اس کا مذموم ومردود ہونا از خود واضح ہے اگر یہ کوشش غیر شعوری ہے تو منکرین حدیث کو خود سوچنا چاہیے کہ دین فہمی کے سلسلے میں وہ کسی مقام پر

کھڑے نظر آتے ہیں؟ واضح رہے کہ عیسائیوں کا موجودہ نظام پاپائیت ''جمہوری انداز'' کا ہے جس میں مذہبی عہدے بانٹے جاتے ہیں اور پوپ کو منتخب کیا جاتا ہے یہاں یہ شبہ باطل ہے کہ انجیل تو محرّف ہے جبکہ قرآن کریم محرّف نہیں۔ اس لئے مرکز ملت کو جزئیات وضع کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ قرآن کریم کے مجمل احکام کو سمجھنے اور ان پر عمل پیرا ہونا خود قرآن کریم کی اپنی تصریح کے مطابق ممکن نہیں جیسا کہ انہی مباحث کے حصہ ''الف'' میں پہلے مذکور ہو چکا ہے۔ اس طرح کی کوشش دراصل اتباع ھویٰ و ہوس ہوگی نہ کہ اتباع قرآن کہلائیگی۔ ان نام نہاد مراکز ملت کے فیصلے باہم متضاد ہوا کرینگے بعینہ جس طرح نظام پاپائیت میں معصوم عن الخطاء سمجھے جانے والے پریوں کے فیصلے باہم متضاد ہیں۔ مثلاً سابقہ ادوار کے پوپوں کے برعکس نئے پوپ یہ نیا فیصلہ دے رہے ہیں کہ یسوع مسیحؑ کو (بقول ان کے) مصلوب کرنے کے جرم سے یہودی بری الذمہ ہیں اس طرح عیسائیوں نے اپنی ہی اناجیل اربعہ کے متن سے آنکھیں پھیر لی ہیں۔

سادساً حکمران اعلیٰ کے ان تشریعی اختیارات کا علم نہ تو صحابہ کرامؓ کو ہوا نہ ہی تابعین اور تبع تابعین پر یہ راز منکشف ہوا اور نہ ہی بعد کے ادوار کے مسلمانوں کو اس کا کچھ پتہ چلا۔ کسی کو بھی یہ معلوم نہ ہو سکا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال ربیع الاول ۱۱ھجری میں آپ کے انتقال کے بعد حجت نہ رہے بلکہ معاذ اللہ بیکار ہو گئے اور یہ کہ ہر دور کے آئندہ حکمرانوں کو جزئیات وضع کرنے کے تشریعی اختیارات منتقل ہو گئے۔ سینکڑوں برس کے بعد اس راز کا علم صرف چند لوگوں (منکرین حدیث) کو ہوا۔ عقل سلیم کے مطابق یہی لوگ جھوٹے ہیں ورنہ پوری امت مسلمہ کو تو جاہل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اگر معاذ اللہ اس بات کو تسلیم کر لیا جائے تو ایسی امت کے ہاتھوں خود قرآن کریم کی حفاظت بھی مشکوک اور مشتبہ ہوگی۔

قرآن کریم اخبار من الغیبات (غیبی خبریں دینے) کے اعتبار سے بالاتفاق معجزہ ہے لیکن فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے اس کا معجزہ ہونا ایسا متفق علیہ نہیں کہ جسے آسانی سے سمجھا جا سکے قرآنی متن میں معمولی تغیر و تبدل سے اس کی فصاحت و بلاغت کا متاثر ہونا یا لوگوں کے علم میں آنا ضروری نہیں۔ الغرض اندریں صورت بھی قرآن کریم پر ایمان ممکن نہ رہا لہذا امت جاہل نہیں بلکہ اس امت سے اپنا رشتہ کاٹنے والے یہ منکرین حدیث ہی باطل پر ہیں قرآن کریم میں ہے **ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبیّن له الهدی ویتّبع غیر سبیل المومنین نولّه ما، تولّی ونصله جهنّم وساء ت مصیرا** (۱۴/۲) ''یعنی جو شخص بعد اس کے کہ ہدایت اس پر واضح ہو چکی رسول کی مخالفت کرے اور مومنین کے راستے کے علاوہ کسی اور راستے کی پیروی کرے تو ہم اس کا رخ ادھر ہی کر دینگے جدھر کا رخ اس نے خود کر لیا ہے اور ہم اسے جہنم میں داخل کرینگے اور وہ برا ٹھکانا ہے''۔ آیت کے نزول کے موقع پر موجود مومنین اصحابِ رسولؐ تھے۔ نہ تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اقوال و افعال کو محدود مدت کے لئے حجت قرار دیا اور نہ ہی خلفائے

راشدینؓ اور دیگر اصحاب رسولؐ نے اس طرح کی کوئی تعلیم دی ورنہ ایسی تعلیم تو نہ صرف زبانی بلکہ عملی تواتر سے بھی آئندہ نسلوں تک منتقل ہوتی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کی مخالفت کرنے والوں کے لئے آیت میں جہنم کی وعید ہے۔

مذکورہ بالا مباحث سے جب یہ دونوں شقیں باطل قرار پائیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی بھی قول وفعل حجت نہیں یا محض اقوال وافعال حجت میں اور بعض نہیں تو تیسری شق خود بخود صحیح ثابت ہوگی کہ آپ کے تمام اقوال وافعال حجت ہیں بالفاظ دیگر حدیث رسول حجت ہے بلکہ مذکورہ مباحث میں ضمناً بھی حدیث رسول کا حجت ہونا ثابت ہوتا چلا آیا ہے۔ (وھوالمطلوب)

(ج) اگر یہ کہا جائے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول وفعل حجت تو ہے لیکن ہم تک مستند ذرائع سے نہیں پہنچا لہذا ہم پر حجت نہ رہا۔ اس مفروضے کی صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن فہمی مثلاً قرآن کریم میں مذکور مجمل احکام ومسائل کا سمجھنا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال یعنی حدیث رسول پر موقوف ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو معاذ اللہ حدیث رسول کی ضرورت ہی نہ رہی اور اسے حجت قرار دینا ہی بے معنیٰ ہوا۔ اگر قرآن فہمی حدیث رسول پہ موقوف ہے اور حدیث محفوظ نہیں تو قرآن کریم ناقابلِ فہم ہوا اور اس کی حفاظت (معاذ اللہ) بے مقصد ٹھہری۔ یہی وجہ ہے کہ آیت انا نحن نزلنا الذکر وانّ لہ لحافظون (۱۵/۱) ''یعنی ہم نے ہی اس نصیحت کو اتارنے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں'' میں لفظ قرآن'' کی بجائے ''الذکر'' لایا گیا ہے۔ قرآن کریم نصیحت نامہ تبھی کہلائیگا جبکہ یہ قابل فہم ہو اور قابل فہم تبھی ہوگا جبکہ حدیث محفوظ ہو۔ پس جب قرآن ''الذکر (نصیحت)'' ہے تو حدیث محفوظ ہے اور اس کے محفوظ نہ ہونے کا دعویٰ جھوٹا ہے۔

کسی چیز کا لکھ لینا اس کی حفاظت کے لئے مفید تو ہے لیکن ناگزیر ہرگز نہیں۔ حفاظت کے اور ذرائع بھی ہو سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم بھی لکھی ہوئی حالت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل نہیں ہوا پس وحی کا فی نفسہ مکتوبی ہونا ضروری نہیں۔ بعد میں صدری حفاظت کے ساتھ اس کی کتابی حفاظت کے پیش نظر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کاتبین وحی سے لکھوایا۔ قرآن کریم کی حیثیت متن کی ہے اور حدیث اس کی قولی وفعلی شرح ہے۔ متن کی روایت باللفظ ہوا کرتی ہے جبکہ شرح میں روایت بالمعنیٰ کی بھی گنجائش ہے کہ معنی ومفہوم کا دوسروں تک پہنچانا اصل مقصود ہوتا ہے گو بعض اوقات اصل الفاظ دوسروں تک منتقل نہ ہوں۔ اس حیثیت سے متن کو شرح پر فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ پہلے پہل صرف قرآن کریم کی کتابت کرائی گئی۔ حدیث کی کتابت سے اس لئے منع کیا گیا کہ متن کا شرح سے التباس نہ ہو یعنی دونوں آپس میں گڈمڈ نہ ہو جائیں۔ جب یہ خدشہ جاتا رہا تو بعض صحابہ کرامؓ مثلاً حضرت عبداللہ بنؓ عمرو بنؓ العاص

نے رسول اللہ صلی علیہ وسلم کی اجازت سے احادیث بھی لکھیں (۲/۱۵) اس کے بعد تابعین اور تبع تابعین کے دور میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ تیسری صدی ھجری میں صحاح ستہ وغیرہ مستند کتب احادیث پر لکھی گئیں۔ سچے اور جھوٹے راویوں کی پہچان کے لئے اسماء الرجال کا فن مدون ہوا اور حدیث کی معرفت وحفاظت کے لئے دیگر کئی متعلقہ علوم حدیث مدون ہوئے۔ تدوین حدیث کی تاریخ اور علوم حدیث کے مطالعہ سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ امت محمدیہؐ نے حدیث کی حفاظت کا واقعی حق ادا کر دیا اور کھرے کو کھوٹے سے الگ کر دکھایا۔ لہذا حدیث کے ہم تک مستند ذرائع سے نہ پہنچنے کا دعوی عقلا ونقلا دونوں طرح باطل ومردود ہے۔ یہ شبہ باطل ہے کہ حدیث چونکہ بالاتفاق ظنی ہے لہذا حجت نہیں۔ ظن کا لفظ قرآن کریم میں تین معانی ''یقین استدلالی'' گمانِ غالب، اٹکل اور اندازہ'' میں مستعمل ہے مثلاً سورہ بقرہ میں نماز کے متعلق ارشاد ہے۔ وانها لكبيرة الا على الخاشعين الذين يظنون انهم ملقوا ربهم وانهم اليه راجعون (۱۶) ''اور بے شک وہ (نماز) بھاری ہے مگر ان عاجزی کرنے والوں پر بھاری نہیں ہے جو یہ ظن رکھتے ہیں کہ ان کی ملاقات ان کے رب سے ہونے والی ہے اور یہ کہ وہ اس کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں''۔ یہاں آیت میں ''یظنون'' سے مراد یہ ہے کہ انہیں اپنے رب سے ملاقات کا یقین دلائل کی بناء پر حاصل ہے۔ ورنہ اگر اس ملاقات میں شک ہو یا اس ملاقات کا محض غالب گمان ہو تو ایسا شخص تو سرے سے مسلمان ہی نہیں۔ ظن کا لفظ گمانِ غالب کے معنی میں بھی آیا ہے مثلاً سورۂ نور میں ہے۔ فلولا اذ سمعتموه ظن المومنون بانفسهم خيراً وقالوا هذا افك مبين (۱۷) ''تو جب تم نے (حضرت عائشہؓ کے متعلق) یہ بات سنی تھی تو مومنون نے اپنے دلوں میں اچھا گمان کیوں نہ قائم کیا اور یہ کیوں نہ کہہ دیا کہ یہ صریح بہتان ہے''۔ یہاں ظن المومنون میں ظن یعنی گمانِ غالب ہے ورنہ اگر حضرت عائشہ صدیقہؓ کی برأت نزول وحی سے پہلے قطعی اور یقینی ہوتی تو خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کیوں پریشان ہوتے؟ اس سے ظن کا معتبر ہونا اور موجب عمل ہونا بھی بخوبی ثابت ہو گیا ورنہ بہتان لگانے والوں پر حد قذف جاری نہ کی جاتی اور حضرت عائشہ صدیقہؓ کے متعلق حُسن وظن قائم نہ کرنے پر سخت تنبیہ نہ کی جاتی۔ حدیث کو ظن کے انہی مذکورہ دو معانی کی بنا پر ظنی کہا جاتا ہے لہذا حدیث کے حجت نہ ہونیکا شبہ باطل ہے۔ ہر یقینی خبر معتبر ہوتی ہے لیکن ہر معتبر خبر کا یقینی ہونا ضروری نہیں بلکہ کسی خبر کے صحیح ہونے کا گمانِ غالب (ظن) بھی اسے معتبر بنانے کے لئے کافی ہے یعنی خبر وروایت کی صحت خواہ یقینی قطعی ہو یا ظنی یعنی گمان غالب ہو، دونوں صورتوں میں خبر وروایت کو معتبر سمجھا جائیگا۔ جبکہ معاملہ احکام کا ہو عقائد کے لئے یقین قطعی درکار ہے یہاں ظن بمعنی یقین استدلالی تو کارآمد ہے بمعنی گمان غالب کارآمد نہیں۔ احکام میں ظنی خبر بھی معتبر ہے مثلاً شرعی امور میں دو معتبر اشخاص اور بعض حالات میں ایک معتبر شخص کی شہادت بھی کافی ہے حالانکہ ایک یا دو اشخاص کی خبر بوجہ خبر واحد ہونے کے ظنی ہے۔ باقی رہا یہ شبہ

کہ دین کے تمام اصول وفروع یقینی وقطعی کیوں نہیں، تو جواب یہ ہے کہ اصول یعنی عقائد تو سب کے سب یقینی قطعی ہیں۔ کفر واسلام کا فرق پیدا کرنے والے کسی عقیدے کی بنیاد ظن بمعنی گمان غالب پر نہیں رکھی جاتی البتہ فروع کے لئے یقین قطعی حاصل ہو جائے تو بہتر ورنہ ظن بمعنی گمانِ غالب بھی انہیں معتبر بنانے کے لئے کافی ہے۔ دنیا کے کسی بھی علم وفن کے سب کے سب مسائل ہمیشہ یقینی قطعی نہیں ہوا کرتے بلکہ بہت سے ظنی بھی ہو سکتے ہیں یہی حال علوم دینیہ کا بھی ہے۔ نیز اگر دین کی سب باتیں یقینی قطعی ہوتیں تو ان پر عمل کرنے میں کوتاہی بہت زیادہ موجب گرفت ہوتی اور ان میں سے کسی کا بھی انکار کردینے والا اسلام سے خارج ہو جاتا۔ اس لئے لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا یہ کرم اور احسان ہے کہ کچھ دینی فروع (احکام) ظنی ہیں۔ انکار کرنے والا کافر نہیں گو فاسق و فاجر ہو۔ تعمیل کے لحاظ سے یقینی وقطعی ذرائع سے حاصل ہونے والے دینی احکام ان احکام کی نسبت سخت تر ہیں جو ظنی ذرائع سے لوگوں تک پہنچے ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب تک حدیث رسول چند در چند راویوں کے ذریعہ نہیں پہنچی بلکہ وہ اکثر و بیشتر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہدایت براہ راست حاصل کرتے تھے لہذا ان کے لئے دینی مسائل اکثر و بیشتر یقینی وقطعی تھے، ظنی نہ تھے۔ اسی لئے دین پر عمل کرنے میں ان کی ذمہ داری دیگر افرادِ امت کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی اسی لئے تو ان کا مقام و مرتبہ بھی بہت بلند و بالا ہے۔ سارا قرآن ان کی مدح کے مضامین سے بھرا پڑا ہے۔ دیگر افراد امت کے مقابلے میں خلفائے راشدینؓ کو خصوصاً اور دیگر اصحاب رسول کو عموماً نہایت بلند امتیازی درجہ حاصل ہے۔ ان کا بعض دینی کاموں پر اجماع مثلاً بیس رکعت نماز تراویح کا رمضان المبارک میں باجماعت اہتمام دین میں زبردست حجت ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا قطعاً غلط ہے کہ بعد کے حکمرانوں کو از خود جزئیات طے کرنے کی آزادی حاصل ہوگئی ہے۔ جہاں تک اجماع کا تعلق ہے تو صحابہ کرامؓ کے بعد کے ادوار کے مسلمانوں کا اجماع بھی دین میں حجت ہے لیکن کسی نام نہاد مرکز ملت کے مفروضہ تشریعی اختیارات سے اس کا دور دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔ الغرض احادیث کا بڑا حصہ گو فرداً فرداً ظنی ہے لیکن مجموعی حیثیت سے حجت ہے اور قرآن کریم کی واضح نصوص کے مطابق رسول کی اطاعت سے ں و زبان دونوں سے دل سے انکار کفر ہے لہذا ا ـیث رسول کی حجیت کا منکر دائرہ اسلام سے خارج ہے۔

ظن کا تیسرا معنی اٹکل ے کا ہے اس معنی میں ظن مذموم ہے قرآن حکیم میں اسی ظن کو مذموم و مردود ٹھہرایا گیا ہے۔ حدیث اس معنی میں ظنی ہے ہی نہیں لہذا منکرین حدیث کا استدلال صحیح نہیں۔ جھوٹے راویوں سے موضوع اور ضعیف راویوں سے ضعیف احادیث بھی مروی ہیں لیکن ان کی وجہ سے پورے ذخیرہ احادیث کو غیر معتبر قرار دینا درست نہیں۔ اگر سچی احادیث موجود نہ ہوتیں اور امت مسلمہ میں ان کی کوئی قدر و اہمیت نہ ہوتی تو جھوٹی احادیث اور روایات وضع کرنے کا جھوٹے راویوں کو خیال ہی

کیوں آتا؟ بازار میں کھوٹے سکے موجود ہوں اور کچھ لوگ دھوکہ کھا کر انہیں قبول بھی کر لیں تو ان کھوٹے سکوں سے کھرے سکوں کی قدر و قیمت ہرگز متاثر نہیں ہوتی۔

۲- حجیت حدیث کے متعلق بعض شبہات کا ازالہ:-

مذکورہ بالا مباحث میں بعض شبہات کا جواب ضمناً مذکور ہے۔ چند دیگر شبہات زیر بحث لائے جاتے ہیں:-

(الف) کسی بھی روایت کی صحت کو پرکھنے کے لئے محدثین نے اصول روایت متعین کئے ہیں تو اصولِ درایت سے بھی کام لیا ہے یعنی یہ بھی دیکھا ہے کہ روایت مسلّمہ عقلی تقاضوں کے خلاف نہ ہو لیکن اس طرح کا فیصلہ کرنا ماہرین فن علماء کا کام ہے، جہلاء کا نہیں۔ لہذا اس طرح کے شبہات باطل ہیں کہ مثلاً بعض احادیث معاذ اللہ بے حیائی کے مضامین پر مشتمل ہیں۔ شرعی اور سماجی ضرورت کے تحت جنسی مسائل اور ان کا ذکر بے حیائی نہیں ورنہ خاوند اور بیوی کے جنسی تعلق کو سب سے بڑی ''بے حیائی'' قرار دینا ہوگا۔ طبی درسگاہوں میں علم تشریح الاعضاء (اناٹومی) اور علم افعال الاعضاء (فزیالوجی) کے تحت مردانہ و زنانہ نظام تولید کو بالتفصیل زیر بحث لانے کو بے حیائی میں داخل کرنا ہوگا۔ فقہ و قانون کی تعلیم میں اور عدالتوں میں حسب ضرورت جنسی امور سے متعلق مسائل، حوادث اور واقعات کو زیر بحث لانا بھی بے حیائی قرار پائے گا۔ خود قرآن کریم میں جنت کے حور و غلمان کے حُسن کا جو تذکرہ جگہ جگہ موجود ہے (معاذ اللہ) اسے بھی قابل اعتراض ٹھہرانا ہوگا۔

یا مثلاً بعض احادیث میں اس طرح کے مضامین بھی قابل اعتراض نہیں کہ سورج اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتا ہے۔ یہاں سجدے سے تکوینی سجدہ (قانونِ فطرت کے مطابق خالقِ کائنات کی فرمانبرداری) مراد ہے۔ نماز والا تشریعی سجدہ مراد نہیں۔ قرآن کریم میں ستاروں اور درختوں کے متعلق سورۂ رحمٰن میں ارشاد ہے والنجم والشجر یسجدان (۱۸) یعنی ستارے اور سورج (اللہ تعالیٰ) کو سجدہ کرتے ہیں''۔

(ب) علم یعنی یقین قطعی کے ذرائع یعنی ''اسباب علم'' تین ہیں۔ حواس سلیمہ، عقل اور خبر صادق۔ خبرِ صادق کی دو قسمیں خبر متواتر اور خبر رسول (وحی) ہیں۔ جو باتیں محض عقل اور حواس سے معلوم نہیں ہوسکتیں تو خبر صادق کا سہارا لینا پڑے گا جس میں وحی بھی شامل ہے مثلاً صرف حواس اور عقل سے یہ ہرگز معلوم نہیں ہوسکتا کہ اقامت صلوٰۃ سے کیا مراد ہے؟ نمازوں کی رکعات کی تعداد، نماز پڑھنے کا طریقہ، نمازوں کے اوقات، اذان و اقامت کے الفاظ و کلمات وغیرہ محض حواس اور عقل سے معلوم نہیں ہوسکتے پس رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کی دینی رہنمائی وحی کے ذریعہ فرمائی ہے۔ بالفاظ دیگر حدیث رسول بھی وحی ہے۔ چونکہ تینوں اسباب علم کا خالق اللہ تعالیٰ ہے لہذا انسان کو جس ذریعے سے بھی علم حاصل ہو، علم سکھانے

کی نسبت بسا اوقات اللہ تعالیٰ اپنی طرف کر لیتا ہے مثلاً ارشاد ہے وعلّم الانسان مالم یعلم (۱۹) ''یعنی اس نے انسان کو وہ کچھ سکھایا جسے وہ نہیں جانتا تھا''۔ تو یہ ''سکھانا'' ضروری نہیں کہ ہر حال میں اصطلاحی وحی کے ذریعہ ہی ہو۔ سورۂ مائدہ میں شکاری کتوں کے ذریعہ شکار کرنے کے شرعی مسئلے کے ضمن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے تعلمو نهنّ ممّا علمکم اللّٰہ (۲۰) ''یعنی تم ان (شکاری کتوں) کو سدھاتے ہو اس علم کے ذریعہ جو اللہ نے تمہیں دیا ہے''۔ شکاری کتوں کو سدھانے کے جو طریقے انسانوں کو معلوم ہیں وہ انہیں وحی کے ذریعہ نہیں بتائے گئے بلکہ حواس کے ذریعہ مشاہدہ و تجربہ سے اور عقل کے ذریعہ غور و فکر سے انسانوں کو معلوم ہوئے ہیں۔ چونکہ حواس اور عقل کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے لہذا انسان ان دونوں ذرائع سے جو علم حاصل کرتا ہے، اللہ تعالیٰ بعض اوقات اسے اپنی طرف منسوب کر لیتا ہے کہ یہ علم اللہ تعالیٰ نے سکھایا ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے کہ جب عورتیں حیض کی آلودگی سے بالکل پاک اور صاف ہو جائیں تو تم ان کے پاس آؤ جہاں سے اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے یعنی اجازت دی ہے۔ فاْتوهن من حیث امرکم اللّٰہ (۲۱) اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس طرح کی اجازت یا حکم سے مراد ایسی اجازت نہیں جو انسان کو بذریعہ وحی حاصل ہوئی ہو بلکہ جنسی خواہش انسانوں اور دیگر حیوانات میں جبلی و فطری خواہش ہے اور انسانی عقل کو اُس کا پورا پورا ادراک حاصل ہے۔ اس طرح کی آیات سے منکرین حدیث نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ قرآن کریم کے علاوہ کوئی اور وحی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل نہیں ہوئی۔ قرآن کریم کے علاوہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کچھ معلوم ہوا وہ بقول ان کے عام اسباب کے تحت حواس اور عقل سے معلوم ہوا۔ حالانکہ سب علوم محض عقل و حواس اور تجربہ و مشاہدہ سے ہی حاصل نہیں ہوتے بلکہ خبر و روایت حصول علم کا سب سے بڑا اور اہم ذریعہ ہے مثلاً سورۂ بقرہ کے دوسرے پارے کے پہلے دو رکوع سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان پہلے کسی اور قبیلے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ بعد میں انہیں خانہ کعبہ (مسجد حرام) کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا۔ احادیث سے ساری صورت حال واضح ہو جاتی ہے کہ یہ قبلہء اول بیت المقدس تھا۔ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کے حکم کا علم محض حواس اور محض عقل سے ہرگز نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ حکم بذریعہ وحی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا مگر قرآن کریم میں بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا کوئی حکم موجود نہیں پس ثابت ہوا کہ آپ پر قرآن کریم کے علاوہ بھی وحی نازل ہوتی تھی۔ اگر آپ نے بیت المقدس کو وحی کے بغیر محض اپنی عقل اور رائے سے قبلہ ٹھہرالیا تھا تو خانہ کعبہ کو قبلہ بنانے کے لئے آپ کو وحی کے انتظار کی کیا ضرورت تھی کہ آپ بڑی بے تابی سے تحویل قبلہ کے لئے وحی کا انتظار فرماتے رہے۔ قدنریٰ تقلّب وجهك فی السماء فلنولیّنك قبلة ترضٰها فولّ وجهك شطر المسجد الحرام (۲۲) ''بلاشبہ ہم آسمان کی طرف تیرے چہرے کا (وحی کے انتظار میں) بار بار اٹھنا دیکھتے

تھے تو ہم ضرور بالضرور تیرا چہرہ اس قبلے کی طرف پھیر دیں گے جسے تو پسند کرتا ہے پس تو اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف پھیر دے''۔ اگر وحی کے بغیر عقل سے ہی شرعی احکام وضع کرنے کی گنجائش ہوتی تو بعثتِ رسول کی سرے سے ضرورت ہی کیا تھی؟

قیاس شرعی کے ذریعہ مجتہدین اور فقہاء جو احکام معلوم کرتے ہیں تو اس قیاس کی بنیاد قرآن و سنت پر رکھی جاتی ہے۔ یعنی جو احکام قرآن و سنت میں مخفی تھے، قیاس کے ذریعہ ظاہر ہو گئے۔ الغرض شرعی مسائل وحی کے بغیر معلوم نہیں ہوتے اور صاحب وحی صرف پیغمبر ہوتا ہے لہذا یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ مسلمانوں کا حاکم اعلیٰ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان فرمودہ جزئیات یا آپ کے فعل سے ثابت شرعی مسائل کو معاذ اللہ مسترد کر کے خود ''شارع'' بن جائیگا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بطور اسناد مجازی شارع اسلئے کہا جاتا ہے کہ صاحب وحی ہونے کی بنا پر آپ دین کے اصول و فروغ بذریعہ وحی اللہ تعالیٰ سے معلوم کر کے لوگوں تک پہنچاتے تھے۔ جو رسول نہیں وہ صاحب وحی نہیں لہذا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اگر وہ دینی مسائل کو منسوخ اور فرسودہ (Out dated) قرار دے کر صرف اپنی عقل سے ہی یا دوسروں کے ساتھ مشورے سے ہی طے کرے گا تو عیسائیوں کے پوپ کی طرح ''خدا کا خود ساختہ اور جعلی نمائندہ'' بن جائیگا۔ عیسائیوں کو تو پھر بھی پوپ کو زبان سے ''خدا'' کہنے کی ہمت نہ ہوئی لیکن منکرین حدیث نام نہاد مرکز ملت کو ''اللہ اور رسول'' قرار دیتے ہیں کہ بقول ان کے قرآن کریم میں جہاں بھی اللہ اور رسول کی اطاعت کا حکم آیا ہے تو وہاں بقول ان کے 'مرکز ملت' مراد ہے۔ یہی وہ پایائیت ہے (بلکہ منکرین حدیث کا پایائیت سے بھی آگے نکل جانا ہے) جسے قرآن کریم نے غیر اللہ کو ''رب بنانا'' قرار دیا ہے (۱/۲۳)۔

الغرض دینی جزئیات مثلاً حلال و حرام کی تفصیل وحی کے بغیر ممکن نہیں ورنہ مختلف ادیان اور مذاہب میں حلال و حرام کے متعلق شدید اختلافات نہ پائے جاتے یا بحث و تمحیص سے یہ اختلافات دور ہو جاتے۔ مثلاً بول و براز کا حرام ہونا محض عقل سے معلوم ہو سکتا تو ہندومت میں گائے کے پیشاب کو متبرک نہ سمجھا جاتا اور اخباری اطلاعات کے مطابق بھارت کے ایک سابق وزیراعظم مرار جی ڈیسائی اپنا پیشاب نہ پیا کرتے اور اسے رسائن (اکسیر صحت) قرار نہ دیتے۔ علاج بالبول (Urine Therapy) زیر بحث نہ آتا۔ کتے، گیدڑ، بلی، چوہے اور بول و براز وغیرہ کا حرام ہونا قرآن کریم سے واضح نہیں تو منکرین حدیث کے لئے یہ سب چیزیں حلال ہونی چاہیں۔ پس قرآن کریم کے بعد حدیث رسول بھی نہایت اہم مأخذ شریعت ہے۔ حدیث وحی غیر متلو ہے یعنی اس کی تلاوت بجائے خود مقصود نہیں۔ حدیث کا مفہوم من جانب اللہ ہے لہذا وحی ہے، الفاظ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں۔ حدیث کے بیان کرنے میں روایت بالمعنی کی گنجائش ہے گو حتی الامکان حضرات صحابہ کرامؓ نے رسول اکرمؐ کی زبان مبارک سے

ادا فرمودہ کلمات کی حفاظت کی ہے۔ چنانچہ اکثر احادیث میں اسناد کے وسیع طُرق کے باوجود متن میں حیرت انگیز مشابہت اور یکسانیت پائی جاتی ہے۔ قرآن کریم وحی متلو ہے۔ اس کا سمجھنا سمجھانا اور اس پر عمل کرنا ہی مقصود و مطلوب نہیں بلکہ اس کی تلاوت بھی مقصود بالذات ہے کیونکہ اس کے الفاظ اور کلمات اللہ تعالیٰ ہی کے ہیں۔ اسی لئے رسول اکرمؐ نے ان کی کتابت بطور خاص کاتبین وحی سے کرائی جبکہ اسے اور اس کی تشریحات (حدیث) کو آئندہ نسلوں تک پہنچانے کی ذمہ داری حسب حیثیت سب اصحاب رسولؐ پر ڈالی گئی۔

(ج) کسی حکم کی عدم تعمیل سے یہ نتیجہ اخذ کرنا قطعاً غلط ہو سکتا ہے کہ تعمیل نہ کرنے والا حاکم کے حکم کو حجت یعنی معتبر اور قابل عمل ہی نہیں سمجھتا۔ بعض اوقات کسی حکم کے الفاظ و کلمات بذاتِ خود مقصود نہیں ہوتے بلکہ نظر اس مصلحت اور فائدے پر ہوتی ہے جو اس حکم کا منشاء ہوتا ہے اگر یہ فائدہ اور مصلحت حکم کی تعمیل کے بغیر پہلے ہی حاصل ہو جائے تو عدم تعمیل بعض صورتوں میں جائز، بعض صورتوں میں بہتر اور بعض صورتوں میں واجب ہوتی ہے۔ مثلاً غزوۂ بنی نصیر میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کے باغات میں کھجوروں کے درخت کاٹنے کا حکم صادر فرمایا تھا لیکن بعض اصحاب نے یہ درخت اس لئے نہیں کاٹے کہ ان کے دیگر ساتھیوں نے جو درخت کاٹے ہیں، ان سے یہودیوں کو مرعوب و مغلوب کرنے کا مقصد پورا ہو چکا ہے۔ جو درخت کاٹے نہیں گئے ہیں، بعد میں مسلمانوں کے کام آئیں گے اللہ تعالیٰ نے سورۂ حشر میں درخت کاٹنے والوں اور نہ کاٹنے والوں دونوں کے عمل کی تصویب فرمائی **ماقطعتم من لینة اوز ترکتموھا قائمة علیٰ اصولھا فباذنِ الله ولیجزی الفاسقین** (۲۳/۲) ''کھجوروں کے جو درخت تم نے کاٹے یا جنھیں تم نے ان کی جڑوں پر کھڑا رہنے دیا تو سب کچھ اللہ کے حکم (اجازت) سے ہوا تاکہ وہ فاسقوں کو رسوا کرے''۔

دوسری مثال یہ ہے کہ مقوقس شاہ مصر نے جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ماریہ قبطیہؓ کو بطور تحفہ ارسال کیا تو ان کے ساتھ ان کا چچازاد بھائی (جس کا نام مابور تھا) بھی بھیج دیا۔ چونکہ سابقہ تعارف کے علاوہ یہ حضرت ماریہ قبطیہؓ کے چچازاد بھائی بھی تھے اور شرعاً لونڈیوں کے لئے پردہ کے احکام بھی سخت نہ تھے، اس لئے یہ حضرت ماریہؓ کے پاس آتے جاتے رہتے تھے۔ منافقین کو تہمت لگانے کا موقع ہاتھ آیا اور بات اس قدر پھیلی کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی سن کر غصہ آیا اور غیرت کی بنا پر آپ نے حضرت علیؓ کو حکم دیا کہ وہ مابور کو قتل کر دیں۔ حضرت علیؓ نے اسے تلاش کیا، اسے قتل کرنا ہی چاہتے تھے کہ اتفاقاً جب مابور کا کپڑا ہٹا تو پتہ چلا کہ وہ تو مردانہ صفات سے عاری ہے۔ چنانچہ حضرت علیؓ نے اسے قتل نہ کیا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سارا واقعہ سنایا تو آپ نے فرمایا کہ حاضر وہ کچھ دیکھ لیتا ہے جو غائب نہیں دیکھ پاتا یعنی شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ اسی طرح حضرت علیؓ ہی سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک خادمہ سے بدکاری کا فعل سرزد ہو گیا تو آپ نے حضرت علیؓ کو حکم دیا کہ اس عورت کو کوڑے لگائے جائیں مگر

حضرت علیؓ کو معلوم ہوا کہ عورت حالت نفاس میں ہے اسے کوڑے اس لئے نہ لگائے کہ وہ کہیں مر ہی نہ جائے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قصہ سن کر فرمایا کہ اے علیؓ! تو نے اچھا کام کیا (۲۴)

کبھی کسی حکم کی تعمیل نہ کرنے کا سبب یہ ہوتا ہے کہ جس کے ذمہ حکم کی تعمیل ہوتی ہے وہ سمجھتا ہے کہ تعمیل خلافِ ادب ہے مثلاً جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ سے صلحنامہ حدیبیہ لکھوا رہے تھے تو قریش مکہ کے سفیر نے صلحنامہ میں ''رسول اللہ'' کے الفاظ پر اعتراض کیا تھا آپ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ یہ لفظ کاٹ دو لیکن حضرت علیؓ نے معذرت کی کہ یہ جسارت مجھ سے نہیں ہوسکتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ لفظ خود کاٹ دیا کیونکہ حقیقت تحریر کی محتاج نہیں ہوا کرتی۔ (۱/ ۲۵)

کبھی عدم تعمیل کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ جسے تعمیل کا حکم ہوتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ حکم کی تعمیل اس کے بس کی بات نہیں وہ خوف زدہ ہوتا ہے کہ حکم کی تعمیل پر رضامندی ظاہر کردی تو ایسا نہ ہو کہ وہ تعمیل نہ کر سکے اور شرمندہ ہونے کے ساتھ ساتھ پشیمان بھی ہونا پڑے مثلاً سورۂ احزاب میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین پر اپنی امانت پیش کی لیکن انہوں نے اس بار امانت کو اٹھانے سے انکار کر دیا اور وہ ڈر گئے۔ فابین ان یحملنها واشفقن منها (۲/ ۲۵)

کبھی کسی حکم کی تعمیل نہ کرنے کی وجہ یہ ہوتی ہے جسے حکم دیا گیا ہو وہ اسے بھاری سمجھتا ہو اور حکم دینے والے سے رعایت کا طالب ہو یا نظر ثانی کی درخواست کرے مثلاً سورۂ مجادلہ کی ابتدائی آیات کا مضمون یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس عورت کی بات سن لی جو آپ سے یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مُجادلہ کر رہی تھی اور اللہ سے اپنی مصیبت کی شکایت کر رہی تھی۔ قد سمع اللہ قول التی تجادلک فی زوجها وتشتکی الی اللہ (۲۱)۔ یہ قصہ حضرت خولہؓ کا ہے ان سے ان کے خاوند نے ظہار کیا تھا مگر ظہار کے متعلق شرعی احکام ابھی نہیں آئے تھے۔ زمانہ جاہلیت میں جس عورت سے ظہار کیا جاتا تھا وہ اپنے خاوند پر حرام سمجھی جاتی تھی۔ آپ نے حضرت خولہؓ سے فرمایا تھا کہ تم اپنے خاوند پر حرام ہوگئی ہو وہ سن کر واویلا کرنے لگیں کہ میری جوانی اس شوہر کی خدمت میں گزر گئی اب میں بڑھاپے میں کہاں جاؤں؟ میرا اور میرے بچوں کا کیا بنے گا؟ ایک روایت میں یہ ہے کہ آپ نے فرمایا تھا کہ تمہارے بارے میں مجھے ابھی کوئی حکم نہیں دیا گیا ہے۔ الغرض حضرت خولہؓ کا اپنے خاوند کے بارے میں واویلا کرنا اور جھگڑنا اس لئے تھا کہ ان کے معاملے میں رعایت کی جائے (۲۷)۔ اسی طرح جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فرشتوں کے ذریعہ بتایا گیا کہ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر عذاب آئیگا تو آپ نے اللہ تعالیٰ سے مجادلہ اور بحث ومباحثہ شروع کر دیا کہ ابھی اس قوم پر عذاب نازل نہ کیا جائے۔ یُجادلنا فی قوم لوط (۲۸)۔

کبھی عدم تعمیل کا سبب یہ ہوتا ہے کہ صیغہ امر سے جو حکم دیا جاتا ہے وہ امر وجوبی نہیں ہوتا کہ اس

کی تعمیل ضروری ہو بلکہ وہ امر اباحت یا امرِ استحبابی ہوتا ہے مثلاً قرآن کریم میں ہے واذا حللتم فاصطادوا (۲۹) ''یعنی (مناسک حج وعمرہ پورے کرنے کے بعد) جب تم احرام کھولو تو شکار کرلیا کرو''۔تو احرام کھولنے کے بعد یہ شکار کھیلنا فرض یا واجب نہیں بلکہ جائز اور مباح ہے۔ نیز سورۂ بقرۃ میں ہے کہ خرید وفروخت اور ادھار کے معاملات لکھ لیا کرو (۳۰) تو یہ لکھنا مستحب اور بہتر ہے، فرض یا واجب نہیں۔

کبھی عدم تعمیل اس لئے ہوتی ہے کہ حکم سے صرف مشورہ دینا مقصود ہوتا ہے اور جسے مشورہ دیا جائے وہ اسے قبول کرنے کا پابند نہیں ہوتا مثلاً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے متبنیٰ حضرت زید بن حارثہؓ کو حکم دیا تھا کہ اپنی بیوی حضرت زینبؓ کو روکے رکھو اور اسے طلاق نہ دو مگر حضرت زیدؓ نے بعد میں طلاق دے دی اور اللہ تعالیٰ نے حضرت زینبؓ کا نکاح خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کردیا لیکن طلاق دینے پر حضرت زیدؓ کو گناہ گار نہیں ٹھہرایا گیا (۳۱)۔

کبھی عدم تعمیل کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ حکم کی حاکم کی طرف نسبت یقینی نہیں ہوتی کہ واقعی نے حاکم نے یہ حکم دیا ہے۔

کبھی عدم تعمیل کا سبب یہ ہوتا ہے کہ حکم کا مطلب اور منشاء سمجھنے میں غلطی ہو جاتی ہے یا اختلاف رائے ہو جاتا ہے یا حکم کی اپنے معنی ومفہوم پر دلالت یقینی اور قطعی نہیں ہوتی بلکہ ظنی ہوتی ہے اسلئے اختلافِ رائے پیدا ہو جاتا ہے۔

کبھی تعمیل نہ کرنے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ تعمیل نہ کرنے والا محض غفلت، لاپرواہی اور تساہل کی وجہ سے تعمیل نہیں کرتا لیکن وہ حاکم کے حکم کا اور حاکم کی حاکمیت کا انکار نہیں کرتا اور اپنے قصور کا اقرار واعتراف کرتا ہے مثلاً بہت سے مسلمان نماز روزہ وغیرہ شرعی احکام سے غافل ہیں۔

کبھی عدم تعمیل کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ حاکم کی حاکمیت اور اتھارٹی کو چیلنج کرنا مقصود ہوتا ہے۔ بلاشبہ یہ صورت بغاوت، سرکشی اور غداری کی ہے۔

اس وضاحت سے یہ معلوم ہوا کہ ہر عدم تعمیل مذموم نہیں ہوا کرتی۔ کسی حکم کو حجت نہ سمجھنا اور بات ہے اور اس پر عمل نہ کرنا اور بات۔ اس باریک فرق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے یا دھوکہ دینے کی غرض سے منکرین حدیث نے صحابہ کرامؓ کی طرف سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض احکام کی ظاہری عدم تعمیل سے یہ غلط استدلال کیا کہ حدیث رسول معاذ اللہ سرے سے حجت ہی نہیں۔ دوسری طرف بعض ظاہر بین سوچے سمجھے بغیر ہر عدم تعمیل پر معترض ہوتے ہیں۔ اگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی حکم کی بعض یا سب اصحاب نے کسی خاص موقع پر تعمیل نہ کی ہو تو اس سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ صحابہ کرامؓ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کو معاذ اللہ حجت ہی نہ سمجھتے تھے یا دوسروں کے لئے حدیث کو حجت نہ سمجھنے کا کوئی جواز یا بہانہ حاصل ہو گیا ہے۔

(د) پیغمبر اللہ تعالیٰ سے بذریعہ وحی جو کچھ بھی حاصل کرتا ہے، اس پر عمل کرنے کا وہ سب سے پہلے مکلف اور پابند ہوتا ہے (۳۲) تاکہ وہ دوسروں کے لئے نمونہ عمل بنے (۳۳) اس لئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر قول وفعل دراصل کتاب اللہ (قرآن کریم) ہی کی عملی تشریح وتبیین ہے خواہ ایسا کرتے ہوئے آپ قرآن کریم کی کسی خاص آیت یا خاص کلمہ کا حوالہ نہ بھی دیں۔ بعض مواقع پر آپ نے قرآن کریم کے کسی خاص مضمون کا حوالہ دے کر کچھ فرمایا تو محدثین نے آپ کے ایسے اقوال یعنی احادیث کو ''تفسیر'' کے عنوان کے تحت اپنی مؤلفات میں جگہ دی اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ باقی عنوانات سے تفسیر قرآن مقصود نہیں ہے۔ نیز احادیث کی یہ عنوان بندی محدثین نے اپنی مؤلفات میں اپنے اجتہاد اور رائے سے کی ہے یہ عنوان بندی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں فرمائی کہ یہ غلط نتیجہ اخذ کیا جائے کہ اگر سب احادیث رسولؐ کی حیثیت تفسیرِ قرآن کی ہوتی جو کتب حدیث میں ''تفسیر'' کا الگ عنوان قائم نہ کیا جاتا۔ مثلاً طہارت، وضو، غسل، نماز، زکوٰۃ، حج، روزہ، جہاد، نکاح، طلاق وغیرہ وغیرہ عنوانات خواہ کتب حدیث میں ہوں یا کتب فقہ میں ہوں ان سے مقصود قرآن کریم کے مجمل احکام تشریح وتوضیح ہی تو ہے۔

(ھ) کسی چیز پر کامل یقین اور اسی چیز کے متعلق قلبی اطمینان کا ہونا لازم وملزوم نہیں اور نہ ہی اس سے کسی کے افضل یا مفضول ہونے کی بحث پیدا ہوتی ہے مثلاً مسلمانوں کا اس بات پر پختہ ایمان یعنی کامل یقین ہے کہ قیامت کے دن مردوں کو زندہ کیا جائیگا اس پر کم وبیش ہر کسی کو اطمینان بھی حاصل ہے لیکن دیکھئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی تھی رب ارنی کیف تحی الموتی (۳۴)۔ ''اے میرے رب! مجھے دکھا تو مردوں کو کس طرح زندہ کرے گا؟'' اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو یہ بتانے کے لئے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مردوں کے دوبارہ زندہ ہونے پر کسی طرح کا کوئی بھی شک ہرگز نہیں تھا، حضرت ابراہیمؑ سے پوچھا اولم تؤمن ''کیا تو ایمان نہیں لایا؟'' اس پر حضرت ابراہیمؑ نے جواب دیا بلیٰ ولکن لیطمئن قلبی'' کیوں نہیں (یقیناً میرا ایمان ہے کہ مردے زندہ کئے جائیں گے) لیکن میں چاہتا ہوں کہ (اس منظر کے مشاہدے سے) میرے دل کو اطمینان حاصل ہو''۔ دیکھئے حضرت ابراہیمؑ کے اس عدم اطمینان کا یہ مطلب نہیں کہ جنھیں یہ اطمینان حاصل ہے وہ سب کے سب حضرت ابراہیم علیہ السلام سے معاذ اللہ افضل ہیں اور حضرت ابراہیمؑ مفضول ہیں۔ کسی کو جس طریقے سے بھی یہ اطمینان حاصل ہو اس سے دوسروں کو یہ حق حاصل نہیں ہو جاتا کہ وہ اس طرح کے واقعات کو مشکوک قرار دیں۔ کبھی نہ صرف یہ کہ قلبی اطمینان نہیں ہوتا بلکہ اضطراب بھی ہوتا ہے جو غیر اختیاری ہوتا ہے حالانکہ ایمان ویقین اپنی جگہ پر قائم ہوتا ہے۔ مثلاً غار حرا میں پہلی وحی کے موقع پر آپ کو اپنے رسول اللہ ہونے پر قطعاً کوئی شک نہیں تھا[1] اس کے

---

[1] بعض روایات سے اس طرح کا تاثر قطعاً غلط ہے۔ اس طرح کی کوئی مرفوع روایت موجود نہیں اور مقطوع روایت ——— قابل احتجاج نہیں۔

باوجود آپ کو پریشانی اور طبعی خوف لاحق ہوا جس کا ذکر آپ نے ام المومنین حضرت خدیجہؓ سے کیا۔ حضرت خدیجہؓ نے اور حضرت خدیجہؓ کے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل نے آپ کو تسلی دی (۳۵) اس سے ان حضرات کا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل ہونا ثابت نہیں ہوتا کہ تاریخ و حدیث کی کتابوں میں مذکور ان واقعات کا انکار کر دیا جائے۔ معراج کے موقع پر پچاس نمازیں فرض ہوئیں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نمازوں میں تخفیف کرانے کا مشورہ اس تجربے اور مشاہدے کی بنا پر تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی قوم بنی اسرائیل کے متعلق حاصل تھا اس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل ہونا ثابت نہیں ہوتا کہ کتب احادیث میں مذکور دونوں حضرات کے اس مکالمے کا انکار کر دیا جائے۔ غزوہ احزاب کے موقع پر حضرت سلمان فارسیؓ نے دشمن کے حملہ سے حفاظت کے لئے مدینہ منورہ کے گرد خندق کھودنے کا مشورہ دیا تھا کیونکہ ایرانی قوم میں اس قسم کے خطرات میں خندق کھودنے کا رواج تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر اصحاب رسول کو اس کا علم نہ تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مشورے کو قبول فرمایا اور اسی پر عمل کیا گیا (۳۷) اس میں خندق کھودنے کے اس واقعہ کا انکار کر دیا جائے۔ بعض اوقات ایک شخص کی قلبی کیفیت مختلف مواقع پر ایک ہی طرح کے واقعہ میں مختلف ہوسکتی ہے مثلاً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سانحہ انتقال پر حضرت عمرؓ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکے اور یہ کہنے لگے کہ جو شخص بھی یہ کہے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا چکے ہیں میں تلوار سے اس کی گردن اڑا دونگا (۳۸) اب اس کا انکار اس بنا پر نہیں کیا جا سکتا کہ قبول اسلام سے قبل حضرت عمر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو (معاذ اللہ) قتل کرنے کے ارادے سے اپنے گھر سے نکلے تھے اگر اس وقت وہ آپ کے اس دنیا سے رخصت ہونے کو ممکن سمجھتے تھے تو جب واقعی آپ کا انتقال ہوا تو حضرت عمرؓ نے اسے کیوں ناممکن سمجھ لیا؟۔ اصل بات یہ ہے کہ قبول اسلام سے پہلے اور قبول اسلام کے سالہا سال بعد والی قلبی کیفیات و واردات کا یکساں ہونا سرے سے ضروری نہیں کہ اسطرح کے اعتراضات وشبہات سر اٹھائیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے یہ معجزہ عطا فرمایا تھا کہ وہ اپنے عصا کو زمین پر پھینکتے تو وہ اژدہا بن جاتا تھا۔ اب کسی کج فہم کا اسطرح کا استدلال ہرگز درست نہیں ہوسکتا کہ چونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کا معجزہ نہیں دیکھایا حالانکہ آپ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے افضل ہیں لہذا میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب مذکورہ معجزے کو صحیح تسلیم نہیں کرتا۔ کتب حدیث و تاریخ میں مذکورہ واقعات کے ردوقبول اور اخذ ونقد میں بھی اس طرح کی کج بحثی اور کج فہمی کا کوئی جواز نہیں۔

﴿حوالہ جات وحواشی﴾

۱- القرآن الکریم - النحل: -۴۴

۲- ایضاً - ھود: -۱۰

۳- ایضا - البقرہ: -۱۲۹

۴- ایضاً - النحل: -۴۴

۵- ایضاً - الشوریٰ: -۲۱

۶- ایضاً - ایضاً: -۵۱

۷- ایضاً - الصافات: -۱۰۲

۸- ایضاً - النساء: -۵۹

۹- ایضاً - ایضاً: -۶۵

۱۰- ایضاً - الذاریات: -۵۶

۱۱- ایضاً - ال عمران: -۳۱

۱۲- ایضاً - النساء: -۸۰

۱۳- ایضاً - ایضاً: -۶۴

۱۴/۱- ایضاً - التوبۃ: -۳۱

۱۴/۲- ایضاً - النساء: - ۱۱

۱۵/۱- ایضاً - الحجر: -۹

۱۵/۲- سنن ابوداؤد: - کتاب العلم

۱۶- القرآن الکریم - البقرہ: -۶۴، ۶۵

۱۷- ایضاً - النور: -۱۲

۱۸- ایضاً - الرحمٰن: -۶

۱۹- القرآن الکریم - العلق: -۵

۲۰- ایضاً - المائدہ: -۴

۲۱- ایضاً - البقرہ: -۲۲۲

۲۲- ایضاً - ایضاً: -۱۴۴

۲۳/۱- ایضاً - التوبۃ: -۳۱

۲/۲۳- ایضاً - الحشر: - ۵

۲۴- اثبات التقلید از مولانا سرفراز خاں صفدر - نصرۃ العلوم گوجرانوالہ صفحات ۱۹۶، ۱۹۰

۱/۲۵- سیرۃ النبیؐ - شبلی نعمانیؒ - محمد سعید اینڈ سنز قرآن محل مولوی مسافر خانہ کراچی، جلد اول صفحہ ۴۰۰۔

۲/۲۵- القرآن الکریم: - الاحزاب: - ۷۲

۲۶- ایضاً - المجادلۃ: - اعاشیہ تفسیر مولانا شبیر احمد عثمانیؒ سورہ مجادلہ

۲۷- مختصر تفسیر ابن کثیرؒ۔ اختصار و تحقیق محمد علی الصابونی دارالقرآن الکریم بیروت جلد سوم صفحات ۵۹-۴۵۸

۲۸- القرآن الکریم - ھود: - ۸۴

۲۹- ایضاً - المائدہ: - ۲

۳۰- ایضاً - البقرہ: - ۲۸۲

۳۱- ایضاً - الاحزاب: - ۳۷

۳۲- ایضاً - الانعام: - ۱۴، ۱۶۳

۳۳- ایضاً - الاحزاب: - ۲۱

۳۴- ایضاً - البقرۃ: - ۳۶۰

۳۵- سیرۃ النبیؐ - جلد اول صفحہ ۲۰۳ - صحیحین عن عائشہؓ مشکوٰۃ صفحہ ۵۱۴

۳۶- حدیث الاسراء عن انس بن مالکؓ للشیخین والترمذی والنسائی بحوالہ جمع الفوائد المکتبۃ الاسلامیۃ سمندری جلد دوم صفحہ ۳۲۳ تا ۳۲۵ حدیث نمبر ۸۴۳۶

۳۷- سیرۃ النبیؐ - جلد اول صفحات ۴۲۱-۴۲۰

۳۸- سیرۃ النبیؐ جلد دوم صفحہ ۱۸۳